ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY



AIOU LIBRARY

Name:

Registration No.:

Course Code: 1961

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس :تفسیر کے اسالیب و مناہج • (1961) سطح :بی ایس علوم اسلامیہ) تخصص قرآن و تفسیر(

سمسٹر :خزاں2026

امتحانی مشق نمبر) 1 یونٹ 1 تا(5

کل نمبر ۱۰۰ :کامیابی کے نمبر50 :

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

)مطالعہ و حوالہ کے لیے(

نوٹ :یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، مفاہیم کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

| 1ترجمے کا مفہوم اور اس کی اقسام 20) نمبر(

سوال نمبر1 ۔ ترجمہ کا مفہوم اور اقسام پر جامع اور مفصل نوٹ تحریر کیجیے۔(20)

تعارف

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی آخری اور جامع ہدایت ہے جو عربی زبان میں نازل ہوئی، کیونکہ اس کے اوّلین مخاطب عرب تھے۔ لیکن اسلام کا پیغام کسی ایک قوم یا خطے تک محدود نہیں؛ یہ پوری انسانیت کے لیے ہے۔ جب اسلام عرب سے نکل کر عجم کی سرزمینوں تک پھیلا تو غیر عرب اقوام کے سامنے یہ بنیادی سوال کھڑا ہوگیا کہ وہ قرآن کے مفاہیم تک کیسے رسائی حاصل کریں۔ اسی ضرورت نے ترجمۂ قرآن کے فن کو جنم دیا۔ ترجمہ وہ پل ہے جو اصل متن اور اس کے قاری کے درمیان زبان کی خلیج کو پاٹتا ہے۔ امت کی تاریخ میں ترجمۂ قرآن ہمیشہ ایک حساس اور ذمہ داری بھرا عمل سمجھا گیا ہے، کیونکہ قرآن محض ایک کتاب نہیں بلکہ کلام الٰہی ہے، جس کے الفاظ بھی مقدس ہیں اور معانی بھی۔ اسی لیے علماء

نے ترجمے کے مفہوم، اس کی اقسام، اس کی شرائط اور اس کے حدود پر مفصل بحث کی ہے۔ ذیل میں ترجمے کا لغوی و اصطلاحی مفہوم، اس کی اقسام اور اس سے متعلق اہم مباحث کو جامع انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

ترجمے کا لغوی مفہوم

لفظ" ترجمہ "عربی زبان کے مادہ" ر ج م "یا بعض اہل لغت کے نزدیک" ت ر ج م "سے اخذ کیا گیا ہے۔ امام ابن منظور نے لسان العرب میں لکھا ہے کہ ترجمہ کرنے کا مطلب ہے کسی کلام کو ایک زبان سے دوسری زبان میں اس طرح منتقل کرنا کہ اس کی وضاحت اور تفسیر ہوجائے۔ لفظ" ترجمان "اسی سے بنا ہے جس کے معنی ہیں وہ شخص جو ایک زبان کی بات دوسری زبان والوں کو سمجھائے، یعنی زبان کی خلیج عبور کرانے والا۔ بعض علماء لغت کے نزدیک ترجمے کے بنیادی معنی تفسیر، بیان اور نقل کے ہیں، یعنی ترجمہ اس عمل کا نام ہے جس میں کسی بات کو ایک لسانی قالب سے نکال کر دوسرے لسانی قالب میں ڈھالا جاتا ہے تاکہ سننے والا یا پڑھنے والا اصل مفہوم سے آگاہ ہوجائے۔ عربی محاورے میں جب کہا جاتا ہے کہ فلاں نے فلاں کے کلام کا ترجمہ کیا تو مراد یہ ہوتی ہے کہ اس نے اس کلام کو دوسری زبان میں بیان کردیا۔ اس لغوی پس منظر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ترجمہ صرف الفاظ کی جگہ الفاظ رکھنے کا نام نہیں بلکہ مفہوم کی امانت دارانہ منتقلی کا نام ہے، اور یہی نکتہ آگے چل کر ترجمۂ قرآن کی شرائط کی بنیاد بنتا ہے۔

ترجمے کا اصطلاحی مفہوم

اصطلاحی سطح پر ترجمے کی مختلف تعریفات کی گئی ہیں۔ معروف تعریف یہ ہے کہ ترجمہ کسی کلام کے مفہوم کو ایک زبان سے دوسری زبان میں اس زبان کے اسلوب اور محاورے کے مطابق منتقل کرنے کا نام ہے، اس قید کے ساتھ کہ اصل معنی میں کوئی کمی بیشی نہ ہو۔ علامہ زرکشی اور امام سیوطی نے علوم القرآن پر اپنی کتب میں ترجمۂ قرآن کی بحث میں اس امر پر زور دیا ہے کہ مترجم کو دونوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل ہو اور وہ اصل متن کے اسلوب، سیاق اور مقاصد سے بھی واقف ہو۔ قرآن مجید کے ترجمے کے اعتبار سے اصطلاحی مفہوم یہ ہے کہ قرآنی آیات کے مفاہیم کو غیر عربی زبان، مثلاً اردو، فارسی، انگریزی یا کسی اور زبان میں اس طرح بیان کیا جائے کہ قاری اصل مراد تک پہنچ سکے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ خود قرآن کا اپنا اعجاز، اس کا نظم اور اس کے الفاظ کا حسن کسی ترجمے میں منتقل نہیں ہوسکتا؛ ترجمہ صرف مفہوم کا ترجمان ہوتا ہے، خود قرآن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن

کا ترجمہ" قرآن "نہیں کہلاتا، نہ اس پر قرآن کے احکام، مثلاً بلا وضو چھونے کی ممانعت یا نماز میں اس کی تلاوت کا جواز، جاری ہوتے ہیں۔

ترجمہ اور تفسیر میں فرق

ترجمہ اور تفسیر دو الگ الگ چیزیں ہیں اگرچہ ان کا باہمی تعلق بہت گہرا ہے۔ ترجمے کا کام اصل متن کے مفہوم کو دوسری زبان کے قالب میں ڈھالنا ہے، اس میں شرح و بسط کی گنجائش نہیں ہوتی؛ مترجم پابند ہوتا ہے کہ وہ اصل متن کی ترتیب اور حد بندی کے اندر رہے۔ اس کے برعکس تفسیر کا کام متن کی شرح ہے :مفسر الفاظ کے معانی کھولتا ہے، مشکلات حل کرتا ہے، اسباب نزول بیان کرتا ہے، ناسخ و منسوخ کی تعیین کرتا ہے اور احکام و حکمتیں استخراج کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ترجمہ متن کا" بدل زبان "ہے اور تفسیر متن کا" شرح و بیان "ہے۔ تاہم جب قرآن کے ترجمے کی بات آتی ہے تو خالص لفظی ترجمہ ممکن نہ ہونے کی وجہ سے ہر کامیاب ترجمہ عملاً تفسیری رنگ اختیار کرلیتا ہے، کیونکہ قرآنی الفاظ کے وہی معانی منتخب کرنے پڑتے ہیں جو سیاق و سباق اور عربی محاورے کے مطابق درست ہوں۔ اسی لیے اردو کے اکثر معروف تراجم کے ساتھ حاشیے یا مختصر تفسیر بھی شامل کی گئی تاکہ قاری غلط فہمی سے بچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے قرآن کے ترجمے کو" ترجمۂ تفسیریہ "کہنا زیادہ مناسب سمجھا ہے۔

قرآن مجید کے ترجمے کی تاریخی جھلک

ترجمۂ قرآن کی تاریخ اسلام کے ابتدائی دور سے ہی شروع ہوجاتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسی حکمرانوں کو دعوتی خطوط بھیجے تو ان کے مفاہیم متعلقہ زبانوں میں سمجھائے گئے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ انہوں نے فارسی بولنے والوں کے لیے سورۂ فاتحہ کا فارسی ترجمہ کیا تھا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ابتداءً نماز میں فارسی ترجمے کی تلاوت کی بحث بھی اسی دور کی علمی فضا کی عکاسی کرتی ہے، اگرچہ بعد میں امت کا عمل عربی متن کی تلاوت ہی پر متعین ہوا۔ خلافت عباسیہ کے دور میں فارسی اور پھر ترکی زبانوں میں تراجم و تفاسیر سامنے آئیں۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے قرآن کا فارسی ترجمہ" فتح الرحمن "کیا اور ان کے صاحبزادوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اردو تراجم کیے جو آج تک اردو ترجمہ نگاری کی بنیاد سمجھے جاتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر کا محاورہ اردو ترجمہ سادگی اور روانی کی عمدہ مثال ہے، جبکہ شاہ رفیع الدین کا

ترجمہ لفظی انداز کا حامل ہے۔ دور جدید میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور دنیا کی درجنوں زبانوں میں تراجم ہوچکے ہیں جن میں سے بعض مستشرقین کے قلم سے بھی ہیں، اور ان کا مقصد و معیار علمی و دینی تراجم سے مختلف ہوتا ہے۔

ترجمے کی اقسام

علماء اور ماہرین لسانیات نے ترجمے کی کئی اعتبار سے تقسیم کیا ہے، مگر قرآن مجید کے ترجمے کے سلسلے میں تین اقسام بنیادی اہمیت رکھتی ہیں :لفظی یا حرفی ترجمہ، معنوی یا تفسیری ترجمہ، اور آزاد ترجمہ۔ ان تینوں کا تفصیلی جائزہ درج ذیل ہے۔

پہلی قسم :لفظی یا حرفی ترجمہ

لفظی ترجمے سے مراد یہ ہے کہ اصل متن کے ہر لفظ کے مقابلے میں دوسری زبان کا ہم معنی لفظ رکھا جائے اور اصل کی ترتیب، ترکیب اور نظم کو حتی الامکان برقرار رکھا جائے۔ اس قسم کے ترجمے کا فائدہ یہ ہے کہ قاری اصل متن کی ساخت سے قریب رہتا ہے اور الفاظ کے انفرادی معانی سے واقفیت حاصل کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ تعلیمی مقاصد کے لیے بین السطوری تراجم اسی طرز پر تیار کیے جاتے ہیں۔ لیکن قرآن مجید کے معاملے میں لفظی ترجمے کی مشکلات بہت زیادہ ہیں۔ عربی زبان کے الفاظ اکثر کثیر المعانی ہوتے ہیں، محاورات اور استعارات کا لفظی ترجمہ مفہوم کو بگاڑ دیتا ہے، اور عربی کی نحوی ترکیبیں دوسری زبانوں میں بعینہٖ منتقل نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام شاطبی اور امام غزالی سمیت بہت سے علماء نے قرآن کے خالص لفظی ترجمے کو ناممکن یا کم از کم ناکافی قرار دیا ہے۔ شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ اسی قسم کی نمائندہ مثال ہے جو اصل سے قرب کے باوجود عام قاری کے لیے دشوار سمجھا جاتا ہے، تاہم اہل علم کے لیے اس کی افادیت مسلم ہے۔

دوسری قسم :معنوی یا تفسیری ترجمہ

معنوی ترجمے میں مترجم الفاظ کی پابندی سے آزاد ہوکر اصل متن کے مفہوم اور مراد کو دوسری زبان کے فطری اسلوب میں ادا کرتا ہے۔ اس میں مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو اثر اصل متن اپنے قاری پر ڈالتا ہے، وہی اثر ترجمہ پڑھنے والے پر بھی پڑے۔ قرآن مجید کے لیے یہی قسم سب سے موزوں اور مقبول قرار پائی ہے، کیونکہ قرآنی مفاہیم کی درست ترسیل اسی صورت میں ممکن ہے جب مترجم سیاق، محاورے اور مفہوم کی گہرائی کو ملحوظ رکھے۔ شاہ عبدالقادر کا اردو ترجمہ،

فتح محمد جالندھری کا ترجمہ، احمد رضا خان بریلوی کا" کنز الایمان "اور مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ اسی معنوی و تفسیری قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس قسم میں مترجم کو جگہ جگہ بریکٹ میں وضاحتی الفاظ کا اضافہ بھی کرنا پڑتا ہے تاکہ ابہام دور ہوجائے، اور یہ اضافہ تفسیر کی ذیل میں آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کو" ترجمۂ تفسیریہ "بھی کہا جاتا ہے اور دنیا بھر کے معتبر قرآنی تراجم کی اکثریت اسی طرز پر ہے۔

تیسری قسم :آزاد ترجمہ

آزاد ترجمے میں مترجم اصل متن کے مفہوم کا خلاصہ یا اس کا آزادانہ اظہار اپنی زبان کے اسلوب میں پیش کرتا ہے؛ اس میں نہ الفاظ کی پابندی ہوتی ہے نہ ترتیب کی، بلکہ بعض اوقات متن کے مرکزی خیال کو نئے پیرائے میں ڈھالا جاتا ہے۔ ادب اور شاعری کے تراجم میں یہ طرز کارآمد ہوسکتا ہے، لیکن قرآن مجید جیسے مقدس اور احکام ساز متن کے لیے آزاد ترجمہ مناسب نہیں سمجھا گیا، کیونکہ اس میں مترجم کی ذاتی رائے اور فہم کے داخل ہونے کا امکان بہت زیادہ ہوتا ہے اور مراد الٰہی کے بگڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض مغربی زبانوں میں کیے گئے آزادانہ تراجم پر مسلم علماء نے سخت تنقید کی ہے کہ انہوں نے مفاہیم کو اپنے مخصوص نظریات کے سانچے میں ڈھال دیا۔ البتہ دعوتی و تبلیغی مقاصد کے لیے قرآنی مفاہیم کو کسی زبان کے سادہ اور عام فہم اسلوب میں پیش کرنا، بشرطیکہ اسے باقاعدہ ترجمہ قرار نہ دیا جائے بلکہ مفاہیم کی توضیح کہا جائے، ایک الگ اور جائز صورت ہے جسے علماء نے" ترجمۂ معانی "کی محتاط حدود میں رکھا ہے۔

اقسام ترجمہ کا خلاصی جدول

قسم	تعریف	قرآن کے لیے موزونیت
لفظی / حرفی	ہر لفظ کا ہم معنی لفظ، اصل ترتیب برقرار	ناکافی؛ تعلیمی و لسانی مقاصد تک محدود
معنوی / تفسیری	مفہوم کی منتقلی ہدفی زبان کے اسلوب میں	سب سے موزوں اور مقبول قسم

آزاد	مرکزی خیال کا آزادانہ اظہار	نامناسب؛ بگاڑ کا اندیشہ

مترجم قرآن کی شرائط

قرآن مجید کے ترجمے کی حساسیت کے پیش نظر علماء نے مترجم کے لیے سخت شرائط مقرر کی ہیں۔ اول یہ کہ مترجم عربی زبان و ادب پر کامل دسترس رکھتا ہو، صرف و نحو، بلاغت، محاورہ عرب اور فصاحت کے اصولوں سے واقف ہو۔ دوم یہ کہ وہ اس زبان پر بھی اسی درجے کا عبور رکھتا ہو جس میں ترجمہ کر رہا ہے، ورنہ مفہوم درست ہوتے ہوئے بھی اظہار ناقص رہ جائے گا۔ سوم یہ کہ مترجم علوم القرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ سے واقف ہو تاکہ آیات کے درست مفاہیم تک رسائی ہو اور کسی آیت کا ایسا ترجمہ نہ کر بیٹھے جو سنت اور اجماع کے خلاف ہو۔ چہارم یہ کہ مترجم کا عقیدہ درست اور اس کی نیت خالص ہو؛ بدعقیدگی یا ذاتی نظریے کی تبلیغ کی نیت ترجمے کو بگاڑ دیتی ہے۔ پنجم یہ کہ مترجم معتبر تفاسیر کی طرف رجوع کرے اور جہاں اشکال ہو وہاں اہل علم سے مشورہ کرے۔ انہی شرائط کی بنا پر علماء کا اتفاق ہے کہ قرآن کا ترجمہ انفرادی ذوق کا کھیل نہیں بلکہ ایک اجتماعی علمی امانت ہے، اور بہتر یہ ہے کہ تراجم اہل علم کی نگرانی اور نظر ثانی سے گزریں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ ترجمہ ایک زبان کے مفہوم کو دوسری زبان میں امانت داری سے منتقل کرنے کا فن ہے، اور قرآن مجید کے معاملے میں یہ فن اپنی حساس ترین صورت اختیار کرلیتا ہے۔ لفظی ترجمہ اصل سے قرب کے باوجود قرآنی مفاہیم کی ترسیل میں ناکافی ہے، آزاد ترجمہ بگاڑ کے اندیشے کی وجہ سے ناقابل قبول ہے، جبکہ معنوی و تفسیری ترجمہ ہی وہ متوازن راستہ ہے جس پر امت کے معتبر تراجم قائم ہیں۔ ترجمہ قرآن کا بدل نہیں بلکہ اس کے مفاہیم تک رسائی کا ذریعہ ہے؛ اصل ہدایت ہر دور میں عربی متن اور اس کی مستند تفسیر ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے قاری کو چاہیے کہ ترجمہ پڑھتے ہوئے معتبر تفسیر کو بھی ساتھ رکھے اور مترجم کی علمی امانت اور شرائط کو پیش نظر رکھ کر ترجمے کا انتخاب کرے۔

| 2قرآنی اصطلاحات اور تفسیر کی ضرورت و اہمیت 20) نمبر(

سوال نمبر2 ۔ قرآنی اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے تفسیر کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے متعدد پہلوؤں سے تفسیر کی اہمیت بیان کیجیے۔(20)

تعارف

قرآن مجید نے اپنے مفاہیم کی ادائیگی کے لیے ایک خاص اصطلاحی نظام وضع کیا ہے۔ یہ اصطلاحات عربی زبان کے عام الفاظ ہی سے لی گئی ہیں، لیکن قرآن نے ان میں نئے شرعی معانی بھر دیے ہیں۔ صلاۃ، زکاۃ، صوم، حج، جہاد، ایمان، تقویٰ، نفاق اور احسان جیسے الفاظ لغت میں کچھ اور معنی رکھتے تھے، مگر قرآنی استعمال میں ان کی ایک مخصوص شرعی حقیقت مقرر ہوگئی۔ جو قاری ان اصطلاحات کو محض لغوی معنوں میں سمجھے گا وہ قرآن کی مراد سے بہت دور رہ جائے گا۔ یہیں سے تفسیر کی ضرورت پیدا ہوتی ہے، کیونکہ تفسیر ہی وہ علم ہے جو اصطلاحات کی شرعی حقیقت، ان کے سیاق اور ان کے تقاضوں کو واضح کرتا ہے۔ اس سوال میں پہلے قرآنی اصطلاحات کی نوعیت اور ان کے فہم میں تفسیر کی ضرورت بیان کی جائے گی، اور پھر تفسیر کی اہمیت کو عقیدہ، عبادت، شریعت، اخلاق اور تمدن سمیت متعدد پہلوؤں سے واضح کیا جائے گا۔

قرآنی اصطلاحات کی نوعیت

قرآنی اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن نے الفاظ کو تین طرح سے استعمال کیا ہے۔ پہلی صورت وہ ہے جہاں لفظ اپنے عام لغوی معنی ہی میں استعمال ہوا ہے، جیسے سماء، ارض اور شمس و قمر۔ دوسری صورت وہ ہے جہاں لفظ کا لغوی پس منظر موجود ہے مگر قرآن نے اسے ایک نئی شرعی حقیقت کا عنوان بنا دیا ہے؛ مثلاً صلاۃ کا لغوی معنی دعا ہے، مگر اصطلاح میں یہ مخصوص ارکان والی عبادت کا نام ہے۔ اسی طرح زکاۃ کا لغوی معنی پاکیزگی اور بڑھوتری ہے، مگر شرعی اصطلاح میں یہ مال کے مقررہ حصے کو مستحقین تک پہنچانے کا نام ہے۔ تیسری صورت وہ ہے جہاں قرآن نے کسی لفظ کو بالکل نئے تصور کے لیے مخصوص کردیا، مثلاً منافق کا لفظ قرآن سے پہلے اس شرعی مفہوم میں معروف نہ تھا۔ اس تین گونہ نوعیت کی وجہ سے اصطلاحات کا فہم محض لغت سے ممکن نہیں رہتا؛ لغت ہمیں مادے کی جڑ بتاتی ہے، جبکہ شرعی مراد سنت، تفسیر اور اہل علم کی وضاحت سے معلوم ہوتی ہے۔

اصطلاحات کے فہم میں تفسیر کی ضرورت

اصطلاحات کے فہم میں تفسیر کی ضرورت کئی جہات سے واضح ہوتی ہے۔ سب سے پہلی جہت یہ ہے کہ اکثر اصطلاحی الفاظ قرآن میں مجمل آئے ہیں؛ مثلاً قرآن نے" اقیموا الصلاۃ وآتوا الزکاۃ "کا حکم دیا مگر نماز کے ارکان، اوقات اور رکعات اور زکاۃ کے نصاب و شرح کی تفصیل قرآن میں مذکور نہیں۔ یہ تفصیل سنت نبوی سے ملی جس کی شرح و ترتیب تفسیر پیش کرتی ہے۔ دوسری جہت یہ ہے کہ بعض اصطلاحات کی مراد سیاق کے بغیر متعین نہیں ہوتی؛ مثلاً" تقویٰ "قرآن میں کبھی خوف خدا، کبھی پرہیزگاری اور کبھی اطاعت کے عام مفہوم میں آیا ہے، اور تفسیر ہی بتاتی ہے کہ کس مقام پر کون سا پہلو غالب ہے۔ تیسری جہت یہ ہے کہ بعض اصطلاحات کی غلط تفہیم سے بڑے اعتقادی اختلافات پیدا ہوئے؛ جیسے ایمان و کفر اور قضا و قدر کی اصطلاحات کو لے کر خوارج، معتزلہ اور معتزلہ جیسے فرقے وجود میں آئے، اور اہل سنت کے مفسرین نے تفسیر کے ذریعے ہی متوازن موقف واضح کیا۔ چوتھی جہت زمانے کی تبدیلی ہے :ہر دور میں نئے سوالات پیدا ہوتے ہیں اور اصطلاحات کا اطلاق نئی صورتوں پر کرنا پڑتا ہے، جو تفسیر و اجتہاد ہی سے ممکن ہے۔

تفسیر کی اہمیت :عقیدے کا پہلو

عقیدے کے پہلو سے تفسیر کی اہمیت یہ ہے کہ توحید، رسالت، آخرت، ملائکہ، کتب اور تقدیر جیسے بنیادی عقائد کا اصل ماخذ قرآن ہے، لیکن قرآن نے ان عقائد کو اجمالی اسلوب میں اور مختلف اسالیب، تمثیلات و اشارات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ صفات باری تعالیٰ سے متعلق آیات متشابہات کے صحیح مفہوم کی تعیین، آیات وعید و وعدہ کی درست مراد اور ایمان کی حقیقت جیسے مباحث تفسیر کے بغیر حل نہیں ہوتے۔ اگر ہر شخص محض لغوی فہم پر اکتفا کرے تو کوئی صفات میں تشبیہ و تجسیم کا شکار ہوگا اور کوئی تعطیل کا۔ مفسرین نے قرآن کی محکم آیات کی روشنی میں متشابہات کی تفسیر کرکے امت کو اعتدال کی راہ دکھائی۔ اسی طرح آخرت کے احوال، حشر و نشر اور جزا و سزا کی تفصیلات کا درست فہم بھی تفسیر ہی عطا کرتی ہے۔ پس عقیدے کی صحت اور تصور دین کی درستگی کا انحصار بڑی حد تک صحیح تفسیر پر ہے۔

تفسیر کی اہمیت :عبادات اور احکام کا پہلو

عملی شریعت کے پہلو سے تفسیر کی اہمیت اور بھی نمایاں ہے۔ قرآن نماز، روزہ، زکاۃ، حج، نکاح، طلاق، میراث، تجارت، حدود و تعزیرات اور جہاد جیسے احکام کا سرچشمہ ہے، مگر یہ احکام عموماً اصول و اجمال کی صورت میں آئے ہیں۔ آیات الاحکام کی تعداد تقریباً پانچ سو بتائی جاتی ہے اور ان کی تشریح کے لیے پورا ایک فن" تفسیر فقہی "وجود میں آیا۔ تفسیر بتاتی ہے کہ کون سی آیت عام ہے اور کون سی خاص، کون سا حکم مطلق ہے اور کون سا مقید، کس آیت کا حکم منسوخ ہوا اور کس کا باقی ہے۔ اسباب نزول کی معرفت بھی احکام کے درست اطلاق کے لیے ناگزیر ہے، کیونکہ کئی آیات کے مفہوم ان کے شان نزول کے بغیر درست طور پر سمجھے ہی نہیں جاسکتے۔ مثال کے طور پر ظہار، لعان اور ایلاء کے احکام ان واقعات کے علم کے بغیر مکمل طور پر واضح نہیں ہوتے جن کے پس منظر میں وہ نازل ہوئے۔ یوں تفسیر قرآن و سنت اور عملی زندگی کے درمیان وہ واسطہ ہے جو شریعت کو قابل عمل بناتی ہے۔

تفسیر کی اہمیت :اخلاق، تاریخ اور تمدنی پہلو

تفسیر کی اہمیت صرف عقیدہ و احکام تک محدود نہیں۔ اخلاقی پہلو سے قرآن نے صبر، شکر، عفو، احسان، صدق اور تواضع جیسی اقدار کو قصص اور مواعظ کے پیرائے میں بیان کیا ہے، اور تفسیر ان قصص سے عبرت و موعظت کے وہ نکتے استخراج کرتی ہے جو محض کہانی پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتے۔ تاریخی پہلو سے قرآن امم سابقہ کے احوال بیان کرتا ہے؛ ان واقعات کی ترتیب، ان کے اسباب اور ان سے مستفاد قوانین و سنن الٰہیہ کی وضاحت تفسیر ہی کرتی ہے۔ تمدنی و سماجی پہلو سے قرآن خاندان، معاشرہ، سیاست اور معیشت کے اصول دیتا ہے، اور ہر دور کے مفسرین نے اپنے عہد کے مسائل کی روشنی میں ان اصولوں کی تطبیق پیش کی ہے، جس سے قرآن کی ہمہ گیری اور ابدیت ثابت ہوتی ہے۔ علمی پہلو سے بھی تفسیر نے عربی لغت، بلاغت، صرف و نحو اور تاریخ جیسے علوم کی ترقی میں بنیادی کردار ادا کیا؛ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی علوم کی پوری عمارت بڑی حد تک قرآن کے فہم کی کوششوں پر کھڑی ہے۔

نتیجہ

نتیجتاً یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ قرآنی اصطلاحات کا صحیح فہم تفسیر کے بغیر ممکن نہیں، کیونکہ یہ اصطلاحات لغوی معانی سے آگے بڑھ کر شرعی حقائق کی حامل ہیں جن کی توضیح سنت، سیاق اور علماء کی محققانہ کاوشوں سے ہی

ہوتی ہے۔ تفسیر کی اہمیت عقیدے کی حفاظت، احکام کی درست تطبیق، اخلاق کی تربیت اور تمدنی رہنمائی سمیت ہر پہلو سے مسلم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے خود تدبر اور اہل ذکر سے سوال کرنے کی تاکید کی ہے، اور امت نے ہر دور میں تفسیر کو سب سے اشرف العلوم کا درجہ دیا ہے۔ جو شخص تفسیر سے بے نیاز ہوکر محض اپنے لغوی فہم پر قرآن سے ہدایت لینے نکلے گا وہ نہ اصطلاحات کی گہرائی تک پہنچے گا نہ آیات کی مراد تک۔

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

| 3تفسیر بالرائے :جواز و عدم جواز پر فریقین کے دلائل 20) نمبر(

سوال نمبر3 ۔ تفسیر بالرائے کے جواز اور عدم جواز پر فریقین کے دلائل بالتفصیل لکھیے۔(20)

تعارف

تفسیر کی دنیا کا ایک قدیم اور اہم ترین مباحث یہ ہے کہ آیا قرآن مجید کی تفسیر میں عقل و رائے کو دخل دینا جائز ہے یا تفسیر صرف منقول روایات تک محدود رہنی چاہیے۔ اس بحث کو" تفسیر بالرائے "کہا جاتا ہے اور اس پر امت کے علماء قدیم سے دو گروہوں میں تقسیم نظر آتے ہیں :ایک گروہ تفسیر بالرائے کو مطلقاً ناجائز اور حرام قرار دیتا ہے، جبکہ دوسرا گروہ شرائط کے ساتھ اسے جائز بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اختلاف کی جڑ" رائے "کے لفظ کے دو مختلف مفاہیم میں ہے۔ جو رائے محض ذاتی خواہش، ظن و تخمین اور بغیر علم کے ہو وہ سب کے نزدیک مذموم ہے، اور جو رائے علم، اجتہاد اور اصول کی بنیاد پر قائم ہو وہ بہت سے علماء کے نزدیک محمود ہے۔ ذیل میں پہلے تفسیر بالرائے کی تعریف اور اس کی اقسام بیان کی جائیں گی، پھر دونوں فریقین کے دلائل بالتفصیل پیش کیے جائیں گے اور آخر میں محققین کا متوازن موقف واضح کیا جائے گا۔

تفسیر بالرائے کی تعریف اور اقسام

تفسیر بالرائے سے مراد قرآن مجید کے مفاہیم کی تعیین میں مفسر کا اپنے اجتہاد، فہم اور عقلی استدلال سے کام لینا ہے، بجائے اس کے کہ وہ صرف صحابہ و تابعین سے منقول روایات ہی پر اکتفا کرے۔ علماء نے تفسیر بالرائے کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ پہلی قسم" رائے محمود "ہے، جس میں مفسر عربی زبان، اصول تفسیر اور شرعی قواعد کی پابندی کرتے ہوئے اجتہاد کرتا ہے؛ یہ رائے علم پر مبنی ہوتی ہے اور اس کی بنیاد قرآن، سنت اور لغت عرب پر ہوتی ہے۔ دوسری قسم" رائے مذموم "ہے جس میں کوئی شخص علم و اہلیت کے بغیر، اپنی خواہش یا فرقہ وارانہ تعصب کی بنیاد پر آیات کے مفاہیم گھڑتا ہے۔ امام سیوطی نے الاتقان میں اور علامہ ذہبی نے" التفسیر والمفسرون "میں اسی تقسیم کو اختیار کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ احادیث میں جس رائے کی مذمت آئی ہے اس سے مراد یہی دوسری قسم ہے۔ یہ تقسیم پوری بحث کی کنجی ہے، کیونکہ فریقین کے دلائل دراصل انہی دو مفاہیم کے گرد گھومتے ہیں۔

عدم جواز کے قائلین کے دلائل :قرآن و حدیث سے

تفسیر بالرائے کے ناجائز ہونے کے قائلین کا پہلا استدلال قرآن مجید سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن کی تفسیر کا حق اصل میں اللہ اور اس کے رسول کو ہے؛ آیت" ثم ان علینا بیانه) "القیامه (19 :سے وہ استدلال کرتے ہیں کہ بیان و تفسیر کی ذمہ داری خود اللہ نے لی ہے، پس کسی کو اپنی رائے سے تفسیر کا حق نہیں۔ اسی طرح سورۂ آل عمران کی آیت متشابہات میں فرمایا گیا کہ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ فتنے کی تلاش میں متشابہات کے پیچھے پڑتے ہیں، جس سے رائے پر مبنی تاویل کی مذمت ثابت ہوتی ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت" ان تقولوا علی اللہ ما لا تعلمون "کو بھی وہ دلیل بناتے ہیں کہ بغیر علم کے اللہ کی طرف کوئی بات منسوب کرنا حرام ہے، اور رائے سے تفسیر کرنا اسی میں داخل ہے۔ حدیث سے ان کی سب سے مشہور دلیل ترمذی وغیرہ کی وہ روایت ہے جس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا، یا بغیر علم کے کچھ کہا، وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنائے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جس نے قرآن میں رائے سے بات کی اور اتفاق سے درست بھی کہہ دی تب بھی اس نے خطا کی۔

عدم جواز کے قائلین کے دلائل :آثار صحابہ و عملی مفاسد

مانعین کا دوسرا بڑا استدلال صحابہ کرام کے طرز عمل سے ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جب ان سے ایک آیت کے بارے میں سوال ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ وہ کیسے اس آیت کی تفسیر اپنی رائے سے کریں اور اگر وہ اس میں غلطی کریں تو کون سی زمین انہیں اٹھائے گی اور کون سا آسمان سایہ کرے گا۔ اسی طرح صحابہ کا عام طریقہ یہ تھا کہ وہ ان آیات کے بارے میں توقف اختیار کرتے تھے جن کی مراد انہیں معلوم نہ ہوتی۔ مانعین کہتے ہیں کہ جب صحابہ جیسی عربی دانی اور قرب زمانی رکھنے والی ہستیاں رائے سے گریز کرتی تھیں تو بعد کے لوگوں کے لیے یہ راستہ اور بھی بند ہونا چاہیے۔ تیسرا استدلال عملی مفاسد سے ہے :تاریخ گواہ ہے کہ باطنیہ، بعض متکلمین اور اہل ہوا نے رائے و تاویل کے نام پر آیات کو اپنے نظریات کے مطابق ڈھالا، جس سے فتنے پھیلے۔ پس سد ذریعہ کے طور پر رائے کا دروازہ بند کرنا ہی امت کے حق میں بہتر ہے۔ ان کے نزدیک محفوظ راستہ یہی ہے کہ تفسیر بالماثور پر اکتفا کیا جائے۔

جواز کے قائلین کے دلائل :قرآن و سنت سے

جواز کے قائلین کا پہلا جواب یہ ہے کہ خود قرآن مجید نے تدبر و تفکر کی دعوت دی ہے۔ ارشاد باری ہے" :افلا یتدبرون القرآن) "محمد (24 :اور" کتاب انزلناہ الیک مبارک لیدبروا آیاتہ) "ص(29 :۔ تدبر کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان عقل و فہم کو کام میں لا کر آیات کے مفاہیم و مقاصد تک پہنچے؛ اگر ہر بات روایت ہی سے معلوم کرنی ہو تو تدبر کا حکم بے معنی رہ جاتا ہے۔ اسی طرح سورۂ نحل کی آیت میں غور و فکر کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے اور" اولی الالباب " یعنی اہل عقل کو قرآن کا مخاطب خاص قرار دیا گیا ہے۔ سنت سے ان کی دلیل حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے جس میں انہوں نے یمن جاتے وقت عرض کیا کہ جہاں کتاب و سنت میں حکم نہ ملے گا وہاں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر اظہار رضا فرمایا۔ اگرچہ یہ حدیث فقہی اجتہاد کے باب میں ہے، مگر اس سے اصولی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ علم و اہلیت کے ساتھ رائے و اجتہاد شریعت میں پسندیدہ ہے۔ مزید یہ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے لیے دعا فرمائی کہ اللہ انہیں دین کی سمجھ اور تفسیر کا علم عطا فرمائے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تفسیر میں فہم و اجتہاد مطلوب ہے۔

جواز کے قائلین کے دلائل :عمل صحابہ و ضرورت

جواز کے قائلین کا دوسرا استدلال خود صحابہ کرام کے عمل سے ہے۔ صحابہ کے درمیان بہت سی آیات کی تفسیر میں اختلاف پایا جاتا ہے، اور یہ اختلاف تنوع کا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اپنی فہم و رائے سے بھی کام لیتے تھے؛ اگر تفسیر خالصتاً توقیفی ہوتی تو اختلاف کا کوئی امکان نہ ہوتا۔ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی تفسیری آراء کتب تفسیر میں بکثرت منقول ہیں۔ تیسرا استدلال ضرورت سے ہے : قرآن کے مفاہیم لا محدود ہیں اور ہر دور میں نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں؛ منقول تفسیر ایک حد تک ہی پہنچتی ہے، خصوصاً بہت سی آیات کے بارے میں کوئی روایت موجود ہی نہیں۔ اگر رائے و اجتہاد کا دروازہ مکمل بند کردیا جائے تو قرآن کی ہدایت زمانے کے سوالات کا جواب دینے سے قاصر رہ جائے گی، جو قرآن کے ابدی اور ہمہ گیر ہونے کے خلاف ہے۔ چوتھی دلیل یہ ہے کہ ممانعت والی احادیث میں" بغیر علم "کی قید موجود ہے، اور اہل علم کا اجتہاد اس قید سے خارج ہے۔

محققین کا متوازن موقف اور شرائط

امام ابن تیمیہ، علامہ زرکشی، امام سیوطی اور علامہ ذہبی سمیت محققین کی رائے یہ ہے کہ دونوں فریقین کے دلائل کو جمع کیا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تفسیر بالرائے کی مذموم صورت حرام اور محمود صورت جائز ہے۔ محمود رائے کے لیے شرائط یہ ہیں کہ مفسر عربی لغت و بلاغت، صرف و نحو، اصول تفسیر، ناسخ و منسوخ، اسباب نزول، حدیث اور فقہ سمیت متعلقہ علوم کا ماہر ہو؛ وہ قرآن کی تفسیر پہلے قرآن سے، پھر سنت سے، پھر اقوال صحابہ و تابعین سے کرے اور رائے کو ان پر مقدم نہ کرے؛ وہ متشابہات کی تاویل میں محکمات کو حاکم بنائے؛ اس کی نیت حق کی تلاش ہو، فرقہ وارانہ تعصب یا شہرت کی طلب نہ ہو؛ اور وہ اجماعی مفاہیم کے خلاف رائے قائم نہ کرے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں تصریح کی ہے کہ جس شخص نے یہ علوم حاصل کرلیے اس کے لیے اجتہاد سے تفسیر کرنا مذموم رائے میں داخل نہیں۔ یوں اختلاف دراصل لفظی ہے :مانعین کی مراد مذموم رائے ہے اور مجوزین کی مراد محمود رائے، اور شرائط کے ساتھ دونوں کا مقصود ایک ہی ہے یعنی قرآن کی حفاظت اور درست فہم۔

نتیجہ

اختتاماً کہا جاسکتا ہے کہ تفسیر بالرائے کے مسئلے میں افراط و تفریط دونوں درست نہیں۔ بغیر علم و اہلیت کے، خواہش و تعصب کی بنیاد پر کی گئی تفسیر قرآن و حدیث کی صریح وعیدوں کے مطابق حرام اور گمراہی کا سبب ہے، اور اسی کی مذمت میں سلف کی سختی آئی ہے۔ لیکن شرائط و اصول کی پابندی کے ساتھ اہل علم کا اجتہاد نہ صرف جائز ہے بلکہ قرآن کے ابدی فہم اور ہر دور کی رہنمائی کے لیے ناگزیر بھی ہے، اور خود صحابہ کا عمل اس کی روشن دلیل ہے۔ طالب علم کے لیے درست رویہ یہ ہے کہ وہ پہلے تفسیر بالماثور کو بنیاد بنائے، پھر اہل علم کی محققانہ آراء سے استفادہ کرے اور خود رائے زنی سے اس وقت تک پرہیز کرے جب تک مطلوبہ علوم میں مہارت حاصل نہ ہوجائے۔

| 4تفسیر القرآن بالقرآن :مفہوم اور طریقے 20) نمبر(

سوال نمبر4 ۔ تفسیر القرآن بالقرآن کا مفہوم بیان کرتے ہوئے اس کے طریقوں پر تفصیلی روشنی ڈالیے۔(20)

تعارف

قرآن مجید کی تفسیر کے جتنے ذرائع ہیں ان میں سب سے پہلا، سب سے معتبر اور سب سے اعلیٰ ذریعہ خود قرآن مجید ہے۔ مفسر جب کسی آیت کی مراد معلوم کرنا چاہتا ہے تو اس کا پہلا قدم یہی ہونا چاہیے کہ وہ اسی مضمون کی دوسری آیات کی طرف رجوع کرے، کیونکہ قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تفسیر خود کرتا ہے۔ اس طریقہ کار کو اصطلاح میں" تفسیر القرآن بالقرآن "کہا جاتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے اپنے مشہور مقدمہ فی اصول التفسیر میں تصریح کی ہے کہ تفسیر کا اصح طریقہ یہی ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے، کیونکہ جو بات کہیں اجمالاً آئی ہے وہ دوسری جگہ تفصیلاً بیان ہوئی ہے اور جو کہیں مختصر ہے وہ کہیں اور مبسوط ہے۔ اس میں اس کا مفہوم، اس کی حجیت و اہمیت، اس کے مختلف طریقے مثالوں کے ساتھ، اور اس کی حدود و فوائد بیان کیے جائیں گے۔

تفسیر القرآن بالقرآن کا مفہوم

تفسیر القرآن بالقرآن سے مراد یہ ہے کہ کسی آیت کے مفہوم کو قرآن مجید کی دوسری آیات کی روشنی میں واضح کیا جائے۔ اس کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ قرآن ایک واحد، مربوط اور ہم آہنگ کلام ہے جس میں کوئی اختلاف و تناقض نہیں؛ خود قرآن کا اعلان ہے" :ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا) "النساء(82 :۔ چونکہ متکلم ایک ہے اور کلام ایک مقصد کے گرد گھومتا ہے، اس لیے ایک مقام کی اجمالی بات دوسرے مقام پر مفصل ملتی ہے، ایک جگہ کا سوال دوسری جگہ جواب پاتا ہے اور ایک جگہ کا حکم دوسری جگہ اپنی قیود و شرائط کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ علامہ شنقیطی نے اپنی تفسیر" اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن "کو اسی منہج پر مرتب کیا اور مقدمے میں لکھا کہ اس تفسیر کا مقصد ہی قرآن کو قرآن سے واضح کرنا ہے۔ اس مفہوم سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طریقہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے؛ آپ سے متعدد مقامات پر ایک آیت کی تفسیر دوسری آیت سے کرنا منقول ہے، مثلاً سورۂ انعام کی آیت میں" ظلم "کی مراد شرک قرار دینا سورۂ لقمان کی آیت" ان الشرک لظلم عظیم "کی روشنی میں تھا۔

پہلا طریقہ :مجمل کی تفصیل

تفسیر بالقرآن کا سب سے عام طریقہ یہ ہے کہ جو بات ایک جگہ مجمل آئی ہو اس کی تفصیل دوسری جگہ تلاش کی جائے۔ مثال کے طور پر سورۂ رحمن میں فرمایا گیا کہ وہ رحمن ہے جس نے قرآن سکھایا، انسان کو پیدا کیا اور اسے بیان سکھایا؛ یہاں مضامین اجمالاً ہیں جبکہ ان کی تفصیلات پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح سورۂ فاتحہ میں "صراط الذین انعمت علیھم "کہہ کر انعام یافتہ لوگوں کی تعیین مجمل رکھی گئی، اور سورۂ نساء کی آیت (69) نے واضح کردیا کہ وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں ایک اور مثال یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا کہ انہوں نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی؛ یہ کلمات کیا تھے، اس کی تفصیل سورۂ اعراف کی آیت (23) میں موجود ہے" :ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا"...۔ یوں مجمل و مفصل کو ملانے سے آیت کا مفہوم مکمل ہوجاتا ہے۔

دوسرا طریقہ :مطلق کو مقید اور عام کو خاص کرنا

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک جگہ آئی ہوئی مطلق بات کو دوسری جگہ کی قید سے مقید کیا جائے، اور عام حکم کو دوسری آیت کی تخصیص سے مخصوص سمجھا جائے۔ مثال کے طور پر سورۂ نساء میں میراث اور دیگر مقامات پر بعض احکام مطلق آئے ہیں جن کی قیود دوسری آیات میں ملی ہیں۔ سورۂ مائدہ میں چوری کی سزا کا حکم عام انداز میں آیا، جبکہ مجموعی قرآنی و سنی نظام میں اس کی شرائط متعین ہیں۔ عام و خاص کی مثال یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں" کتب علیکم القصاص "کا عمومی حکم آیا اور اسی سورت کی آیات میں اس کی تفصیلی صورتیں اور دیت و معافی کے احکام بیان ہوئے۔ اسی طرح" الطلاق مرتان "والی آیت نے طلاق کے عمومی تصور کو دو رجعی طلاقوں کی حد سے مقید کردیا۔ مفسر جب ان مقامات کو باہم ملاتا ہے تو شریعت کا حکم اپنی مکمل اور متوازن صورت میں سامنے آتا ہے، اور یہی باہمی تقیید و تخصیص تفسیر بالقرآن کا ایک بنیادی کارنامہ ہے۔

تیسرا طریقہ :الفاظ کی لغوی و اصطلاحی مراد کی تعیین

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ کسی آیت کے مشکل لفظ یا اصطلاح کی مراد قرآن کے دوسرے مقامات کے استعمال سے متعین کی جائے، کیونکہ قرآن کی زبان کا سب سے معتبر ماخذ خود قرآن کا اسلوب ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ قارعہ میں" القارعہ "

کی شدت کو خود اسی سورت کی اگلی آیات نے واضح کیا کہ اس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے۔ لفظ "الکوثر "کی مراد میں مفسرین نے قرآن کے دیگر استعمالات سے رہنمائی لی۔ اسی طرح" یوم الدین "کی تشریح سورۂ انفطار کی آیت نے کی کہ وہ دن جب کوئی نفس کسی کے لیے کچھ اختیار نہ رکھے گا۔ لفظ" تقویٰ"،" بر"،" اثم "اور" فسق " جیسی اصطلاحات کی جامع مراد بھی قرآنی مقامات کے موازنے ہی سے متعین ہوتی ہے۔ یہ طریقہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہر لفظ کا قرآنی استعمال اس کے لغوی معنی سے بعض اوقات آگے بڑھ کر ایک خاص مفہوم اختیار کرلیتا ہے، اور اس خاص مفہوم تک رسائی کا ذریعہ قرآن کے جمیع مقامات کا استقراء ہے۔

چوتھا طریقہ :قصص و واقعات کی باہمی تکمیل

چوتھا طریقہ قصص قرآنی سے متعلق ہے۔ قرآن نے انبیاء کے واقعات کو ایک ہی جگہ مکمل بیان کرنے کے بجائے مختلف سورتوں میں ضرورت و مقصد کے مطابق تقسیم کرکے بیان کیا ہے؛ کسی جگہ واقعہ کا ایک پہلو ہے اور کسی جگہ دوسرا۔ مفسر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام یا اصحاب کہف کے واقعات کی تمام قرآنی آیات کو اکٹھا کرتا ہے تو واقعے کی مکمل اور مربوط تصویر سامنے آتی ہے اور ابہامات دور ہوجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق و سجدہ ملائکہ کا واقعہ بقرہ، اعراف، حجر، اسراء، کہف اور طٰہٰ سمیت کئی سورتوں میں آیا ہے اور ہر مقام پر کچھ نئی تفصیل یا نیا پہلو موجود ہے۔ اسی طرح متشابہ قصص میں تکرار بے مقصد نہیں ہوتی بلکہ ہر تکرار اپنے سیاق کے موافق ایک خاص سبق لیے ہوئے ہوتی ہے، جس کی نشاندہی باہمی موازنے سے ہوتی ہے۔ البتہ اس طریقے میں احتیاط یہ ہے کہ قصص کی تکمیل کے لیے اسرائیلی روایات پر انحصار کرنے کے بجائے پہلے قرآنی مواد ہی کو بنیاد بنایا جائے۔

پانچواں طریقہ :سوال و جواب اور مبہم کی تعیین

پانچواں طریقہ یہ ہے کہ قرآن میں جہاں کوئی سوال اٹھایا گیا ہو یا کوئی بات ابہام کے ساتھ آئی ہو، اس کا جواب یا تعیین دوسری آیات میں دیکھی جائے۔ قرآن کا اسلوب ہے کہ وہ بسا اوقات ایک جگہ" یسئلونک "کے ذریعے سوال نقل کرتا ہے اور اس کا جواب بھی دیتا ہے، جبکہ بعض اوقات ایک سورت میں اٹھنے والا اشکال دوسری سورت میں حل ہوتا ہے۔ مبہم کی تعیین کی مثال سورۂ طارق میں" النجم الثاقب "ہے جس کی مراد اسی سورت کے سیاق سے واضح ہوتی ہے، اور

سورۂ بقرہ میں" الذی بیدہ عقدۃ النکاح "جیسے مبہمات کی تعیین میں مفسرین نے قرآنی سیاق اور دیگر آیات سے مدد لی ہے۔ اسی طرح سورۂ قدر میں" لیلۃ القدر "کی فضیلت کا اجمالی بیان آیا اور سورۂ دخان کی آیات نے اس رات کی برکت و خصوصیت کو مزید واضح کیا۔ یہ طریقہ مفسر کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ قرآن کو ایک وحدت کے طور پر پڑھے نہ کہ بکھری ہوئی آیات کے مجموعے کے طور پر۔

اہمیت، فوائد اور حدود

تفسیر القرآن بالقرآن کی اہمیت اس لیے سب سے بڑھ کر ہے کہ اس کا ماخذ خود وحی ہے، جس میں خطا کا امکان نہیں۔ اس طریقے سے مفسر ذاتی رائے کے خطرات سے محفوظ رہتا ہے، آیات کے درمیان ہم آہنگی ظاہر ہوتی ہے اور قرآن کی وحدت و اعجاز کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ اس کے فوائد میں یہ بھی شامل ہے کہ بہت سے بظاہر متعارض مقامات کا تعارض دور ہوجاتا ہے اور ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔ تاہم اس طریقے کی حدود بھی ہیں :ہر آیت کی تفسیر قرآن ہی میں نہیں ملتی؛ بہت سے مفاہیم کی تفصیل سنت نبوی میں ہے، اس لیے تفسیر بالقرآن کے بعد دوسرا درجہ تفسیر بالسنت کا ہے۔ نیز اس طریقے میں مہارت اسی کو حاصل ہوتی ہے جسے پورے قرآن پر عبور ہو اور وہ مواضع کے باہمی تعلق کو سمجھتا ہو، ورنہ غلط ملاپ سے مفہوم بگڑ بھی سکتا ہے۔ اسی لیے مفسرین نے اسے پہلا مگر واحد ذریعہ نہیں مانا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ تفسیر القرآن بالقرآن تفسیر کا سب سے معتبر اور اصح طریقہ ہے جس میں مجمل کی تفصیل، مطلق کی تقیید، عام کی تخصیص، الفاظ کی مراد کی تعیین اور قصص کی باہمی تکمیل جیسے طریقوں سے آیات کی تشریح خود قرآن سے کی جاتی ہے۔ یہ منہج نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عمل سے ثابت ہے اور ابن کثیر سے لے کر شنقیطی تک بڑے مفسرین نے اسے اساس بنایا ہے۔ طالب علم کے لیے اس کا سبق یہ ہے کہ کسی بھی آیت کی تفسیر پڑھنے سے پہلے اسی مضمون کی دیگر آیات کو دیکھنا چاہیے، کیونکہ قرآن خود اپنا بہترین مفسر ہے۔

| 5فقہی تفسیر :مفہوم، ارتقاء اور نمائندہ تفاسیر 20) نمبر(

سوال نمبر5 ۔ فقہی تفسیر کا مفہوم، ارتقاء اور نمائندہ تفاسیر تحریر کیجیے۔(20)

تعارف

قرآن مجید صرف عقائد و اخلاق کی کتاب نہیں بلکہ ایک مکمل ضابطہ حیات بھی ہے۔ اس میں عبادات سے لے کر معاملات، خاندانی زندگی سے لے کر ریاستی نظام تک کے احکام موجود ہیں۔ ان احکام سے متعلق آیات کو" آیات الاحکام " کہا جاتا ہے اور ان آیات کی شرح و توضیح اور ان سے فقہی مسائل کے استخراج پر مبنی تفسیر کو" فقہی تفسیر "کہتے ہیں۔ علم تفسیر کی تاریخ میں یہ شاخ بڑی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اسی کے ذریعے قرآن اور فقہ کے درمیان وہ رشتہ قائم ہوا جس نے پورے اسلامی قانون کی بنیاد فراہم کی۔ ہر فقہی مکتب کے علماء نے آیات الاحکام کی تفسیر اپنے اصول و قواعد کے مطابق کی اور عظیم الشان کتب تصنیف کیں۔ ذیل میں فقہی تفسیر کا مفہوم، اس کا تاریخی ارتقاء مختلف ادوار میں، اس کی نمائندہ تفاسیر کا تعارف اور اس کے منہج کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔

فقہی تفسیر کا مفہوم

فقہی تفسیر سے مراد قرآن مجید کی وہ تفسیر ہے جس کا مرکز و محور آیات الاحکام ہوں، یعنی وہ آیات جن سے عقائد و اخلاق کے بجائے عملی زندگی کے شرعی احکام مستنبط ہوتے ہیں۔ ان آیات کی تعداد کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے؛ مشہور قول کے مطابق یہ تقریباً پانچ سو ہیں، جبکہ امام غزالی سمیت بعض علماء نے ان کی اصل تعداد اس سے کم بتائی ہے کیونکہ بہت سی آیات میں احکام ضمناً آئے ہیں۔ فقہی مفسر کا کام صرف احکام کا بیان نہیں ہوتا بلکہ وہ آیات کے الفاظ کی لغوی تحقیق، ان کے عموم و خصوص، اطلاق و تقیید اور نسخ کی بحث کرتا ہے، پھر اصول فقہ کے قواعد کی روشنی میں حکم استخراج کرتا ہے اور فقہی اختلافات کا جائزہ لے کر دلائل کی بنیاد پر ترجیح قائم کرتا ہے۔ اس اعتبار سے فقہی تفسیر دراصل تفسیر اور اصول فقہ کا سنگم ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ فقہی تفسیر پوری قرآن کی مکمل تفسیر بھی ہوسکتی ہے جیسے قرطبی کی الجامع، اور صرف آیات الاحکام تک محدود بھی ہوسکتی ہے جیسے جصاص اور ابن العربی کی احکام القرآن۔

ارتقاء :عہد نبوی و عہد صحابہ

فقہی تفسیر کا آغاز خود عہد رسالت سے ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے اولین مفسر تھے اور آپ احکام کی عملی تفصیل اپنے قول و فعل سے پیش کرتے تھے؛ نماز، زکاۃ اور حج کے احکام اسی عملی تفسیر کا نتیجہ ہیں۔ عہد صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم جیسے صحابہ نے آیات الاحکام کی توضیح کی۔ صحابہ کا منہج یہ تھا کہ وہ قرآن، سنت اور پھر اپنی اجتہادی رائے سے حکم معلوم کرتے تھے۔ اس دور میں اختلافات محدود تھے اور مسائل بھی کم پیچیدہ تھے۔ تابعین کے دور میں جب اسلامی ریاست پھیل گئی اور نئے مسائل پیدا ہوئے تو احکام کے استخراج کی ضرورت بڑھ گئی۔ حضرت سعید بن المسیب، عطاء بن ابی رباح اور حسن بصری جیسے تابعین کے تفسیری اجتہادات کتب میں محفوظ ہیں۔ اس دور کو فقہی تفسیر کا دور تکوین کہا جاسکتا ہے جس میں بعد کی منظم تصانیف کی بنیاد پڑی۔

ارتقاء :فقہی مذاہب اور باقاعدہ تصانیف کا دور

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں فقہی مذاہب کی تدوین کے ساتھ فقہی تفسیر بھی باقاعدہ تصانیف کی صورت اختیار کرگئی۔ امام شافعی رحمہ اللہ نے" احکام القرآن "کے نام سے اس فن کی پہلی منظم کوشش کی، جو بعد میں امام بیہقی کی جمع و ترتیب سے ہم تک پہنچی؛ اس میں آیات سے استنباط کے اصولوں کو بھی واضح کیا گیا۔ اسی دور میں امام ابوحنیفہ کے شاگردوں اور اہل الرائے نے عراق میں، اور امام مالک کے مکتب نے مدینہ میں آیات الاحکام پر کام کیا۔ تیسری صدی میں محمد بن ادریس شافعی کے منہج سے متاثر ہوکر اور پھر چوتھی و پانچویں صدی میں یہ فن اپنی پختگی کو پہنچا :ابوبکر جصاص رازی نے حنفی نقطہ نظر سے، قاضی ابن العربی اور بعد میں امام قرطبی نے مالکی نقطہ نظر سے، اور ابوالحسن کیا ہراسی نے شافعی نقطہ نظر سے عظیم کتب لکھیں۔ اس دور کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر مفسر اپنے مکتب کے اصولوں کی روشنی میں آیات سے اپنے فقہی موقف کی تائید پیش کرتا اور مخالف دلائل کا علمی جواب دیتا تھا۔ اگرچہ اس سے فقہی تفسیر میں مکتبی رنگ آگیا، مگر علمی مباحث کی گہرائی اور استدلال کی پختگی میں بے پناہ اضافہ بھی ہوا۔

نمائندہ تفاسیر :احکام القرآن للجصاص اور ابن العربی

فقہی تفاسیر میں سب سے پہلی نمائندہ کتاب ابوبکر احمد بن علی جصاص رازی) وفات370 ھ (کی" احکام القرآن "ہے۔ یہ حنفی مکتب کی نمائندہ تفسیر ہے جو آیات الاحکام کی ترتیب وار شرح ہے۔ جصاص کا منہج یہ ہے کہ وہ آیت کے تحت فقہی مسائل بیان کرتے ہیں، فقہا کے اختلافات نقل کرتے ہیں، دلائل کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں اور اصول فقہ کے قواعد استعمال کرکے ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی کتاب کو اصول فقہ اور فقہ حنفی کی بنیادی ماخذات میں شمار کیا جاتا ہے۔ دوسری نمائندہ کتاب قاضی ابوبکر ابن العربی مالکی) وفات543 ھ (کی" احکام القرآن "ہے۔ ابن العربی نے آیات الاحکام کو مسائل کی صورت میں تقسیم کیا ہے؛ ہر آیت کے تحت مسائل نمبروار بیان کیے جاتے ہیں جن میں لغت، تفسیر، فقہ اور اصول سب جمع ہوجاتے ہیں۔ ان کا اسلوب فیصلہ کن اور استدلال مضبوط ہے، اور مالکی فقہ کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ وہ دیگر مذاہب کے دلائل کا بھی محققانہ جائزہ لیتے ہیں۔ یہ دونوں کتب اس فن کی بنیادی ستون سمجھی جاتی ہیں۔

نمائندہ تفاسیر :الجامع لاحکام القرآن) قرطبی (و دیگر

فقہی تفسیر کی سب سے جامع اور مقبول کتاب امام ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی) وفات671 ھ (کی" الجامع لاحکام القرآن "ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس میں پورے قرآن کی تفسیر ہے مگر مرکز احکام و فقہ ہے۔ قرطبی ہر آیت کے تحت مسائل قائم کرتے ہیں، ان میں لغوی تحقیق، قراءات، اعراب، اسباب نزول، فقہاء کے اقوال اور ان کے دلائل، پھر اپنی ترجیح پیش کرتے ہیں۔ ان کی امتیازی خوبی انصاف پسندی اور وسعت مطالعہ ہے؛ وہ اپنے مالکی مکتب کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے دلائل بھی پوری امانت سے نقل کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ شافعی مکتب سے ابوالحسن علی بن محمد کیا ہراسی) وفات504 ھ (کی" احکام القرآن "اور امام بیہقی کی مرتب کردہ امام شافعی کی" احکام القرآن "مشہور ہیں۔ متاخرین میں مفتی محمد شفیع کی" احکام القرآن) "اردو (اور مولانا ظفر احمد عثمانی کی" احکام القرآن "بھی اسی روایت کی اہم کڑیاں ہیں، جبکہ جدید دور میں آیات الاحکام پر موضوعاتی مطالعات کا رجحان بھی بڑھا ہے۔ فقہی تفاسیر کی یہ پوری روایت ظاہر کرتی ہے کہ قرآن سے احکام کا استخراج امت کا مسلسل اور منظم علمی کام رہا ہے۔

نمائندہ فقہی تفاسیر

کتاب	مصنف	مکتب
احکام القرآن	ابوبکر جصاص رازی(370) ھ	حنفی
احکام القرآن	قاضی ابن العربی(543) ھ	مالکی
الجامع لاحکام القرآن	امام قرطبی(671) ھ	مالکی
احکام القرآن	کیا ہراسی(504) ھ	شافعی

فقہی تفسیر کے منہج کی خصوصیات اور اہمیت

فقہی تفسیر کے منہج کی چند خصوصیات نمایاں ہیں۔ اول یہ کہ اس میں آیات کے ہر لفظ کی نحوی و لغوی تحلیل کی جاتی ہے کیونکہ حکم کا مدار الفاظ کی دلالت پر ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ عام و خاص، مطلق و مقید، امر و نہی کی دلالت اور مفہوم مخالف جیسے اصولی مباحث مرکز نگاہ ہوتے ہیں۔ سوم یہ کہ سنت کو قرآن کے بیان کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور آیات و احادیث کے درمیان تطبیق کی کوشش کی جاتی ہے۔ چہارم یہ کہ فقہی اختلافات کو علمی انداز میں بیان کرکے دلائل کی بنیاد پر ترجیح دی جاتی ہے۔ اس تفسیر کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اسلامی قانون کو قرآن سے مربوط رکھا، فقہ کو دلیل کی بنیاد فراہم کی اور امت کو ہر دور میں پیش آمدہ مسائل کے حل کے لیے قرآنی اصول دیے۔ اس کا ایک تنقیدی پہلو یہ بھی ہے کہ بعض مفسرین نے اپنے مکتب کی تائید میں آیات کی وسعت کو محدود کردیا، جس پر بعد کے محققین نے متوازن تنقید کی ہے اور یہ تنقید بھی اسی فن کی علمی زندگی کی علامت ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ فقہی تفسیر قرآن مجید کے عملی احکام کو سمجھنے اور ان سے زندگی کے مسائل حل کرنے کی منظم علمی کوشش ہے جس کا آغاز عہد رسالت سے ہوا، صحابہ و تابعین کے دور میں اس کی بنیاد پڑی اور فقہی مذاہب کی تدوین کے ساتھ یہ پختہ تصانیف کی صورت اختیار کرگئی۔ جصاص، ابن العربی اور قرطبی کی کتب اس فن کے شاہکار ہیں جو آج بھی فقہ و اصول کے طالب علم کے لیے ناگزیر ماخذ ہیں۔ فقہی تفسیر نے یہ ثابت کیا کہ قرآن محض تلاوت و برکت کی کتاب نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے کے لیے قانون و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔